کلام اقبال کی تاثیر موقع و محل کے اعتبار سے

پروفیسر محمد اسلم پنجاب یونیورسٹی لاہور،

ڈاکٹر محمد یوسف حسین خاں مرحوم اپنی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی دنیا" میں تحریر فرماتے ہیں کہ مشہور امریکی ادیب والڈ ہرنٹ من نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس سے بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک آدمی ایک کتاب کہاں پڑھ رہا ہے۔ والڈ ہٹ من لکھتا ہے کہ اسے دانتے کی ڈیوائن کومیڈی کو جنگل میں پڑھنے میں جو لطف ملا وہ شہر میں پڑھنے میں کبھی نہیں ملا۔ اسی طرح ہومر کی الیڈ کا لطف سمندر کے کنارے دوبالا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں دیوان غالب پڑھنے کا جو مزہ جنوبی فرانس کے شہر تولون میں آیا ویسا مزہ اور کہیں نہیں آ سکتا۔ راقم الحروف کو بھی اسی طرح کے تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آج سے تقریباً ربع صدی قبل میں نے حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی مشہور غزل جس کے چند اشعار یہ ہیں:

قصد را از مشہد ما مشرب خونی دام می گیرد
کہ تا رنگین کند ہنگامہ روز قیامت را

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

دماغ من دریں جا گاہ گاہی چاق می گردد

خدا آباد تر سازد خرابات محبت را

بجائے سنگ طفلاں پارہائے شیشہ باید زد

چو مظہر مرزا دیوانہ نازک طبیعت را

دہلی میں ان کے مزار پر انوار پر بیٹھ کر پڑھی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں واقعی خرابات محبت میں بیٹھا مرزا صاحب کا کلام پڑھ رہا ہوں اسی طرح ایک بار مجھے پانی پت میں قلندر صاحب کی درگاہ کے احاطے میں خواجہ الطاف حسین حالی کے مزار پر بیٹھ کر ان کی مشہور مناجات :-

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے

پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ

خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں

اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

پڑھنے کی سعادت ملی اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خاصۂ خاصان رسل کے بنفس نفیس وہاں موجود ہیں اور میری مناجات حالی کے الفاظ میں سماعت فرما رہے ہیں راقم الحروف کو متعدد بار مغربی انگلستان کے ایک ڈسٹرکٹ جانے اور وہاں مشہور

جھیل گراسمیر دیکھنے کا موقع ملا یہی وہ جھیل ہے جس کے کنارے ورڈز ورتھ نے اپنی لافانی نظم ڈیفوڈلز لکھی تھی آج بھی اس جھیل کے کنارے تاحد نظر ڈیفوڈلز لہلہاتے نظر آتے ہیں تو قطرے میں سمندر اور ذرے میں آفتاب دیکھنے والی نظریں ان قدرتی مناظر میں خالق کائنات کا جلوہ دیکھ لیتی ہیں۔

ورڈز ورتھ کو وحدت الوجودی شاعر مانا جاتا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے مناظر قدرت پر بہترین نظمیں لکھی ہیں۔ میں نے اس کی مشہور نظم ٹنٹرن ایبے پڑھی اور پھر ٹنٹرن ایبے دیکھنے گیا۔ یہ مقام ویلز اور انگلستان کی سرحد پر وائی ندی کے کنارے واقع ہے ایک سرسبز وادی جو چاروں طرف سے سرسبز پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ پیالے کی مانند نظر آتی ہے اس وادی میں سے ایک ندی لہراتی اور بل کھاتی ہوئی گذرتی ہے ندی کے کنارے ایک شکستہ گرجا کی فلک بوس عمارت کھڑی ہے اس عمارت کی عظمت رفتہ اور اس کے ماحول سے متاثر ہو کر ورڈز ورتھ نے اپنی لافانی نظم ٹنٹرن ایبے لکھی تھی۔ اس نظم میں وحدت الوجود کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے اور قارئین پیالہ میں عکس رُخ یار کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ورڈز ورتھ کی ڈیفوڈلز پڑھنے کا جو لطف جھیل گراسمیر کے کنارے آئے گا ویسا لطف اور کسی جگہ نہیں آسکتا۔ اسی طرح ٹنٹرن ایبے پڑھنے میں جو سرور ٹنٹرن ایبے کے قریب وائی ندی کے کنارے ملتا ہے ویسا کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اسی طرح حافظؔ شیرازی کی یہ غزل :-

خوشا شیراز و وضع بے مثالش | خداوندا نگہدار از زوالش
زرکناباد ما صد لوحش اللہ | کہ عمر خضر می بخشد زلالش
میان جعفر آباد و مصلیٰ | عبیر آمیز می آید شمالش
بشیراز آی و فیض روح قدسی | بخواہ از مردم صاحب کمالش

کے پڑھنے کا لطف شیراز ہی میں آسکتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب ۱۹۶۸ء میں راقم الحروف کو ایک پارسا کی معیت میں وادیٔ کشمیر کی سیاحت کا موقع ملا اور اس سفر میں مجھے سری نگر کے علاوہ پہلگام، ٹنگمرگ، گلمرگ، اچھابل، کوکرناگ اور اسلام آباد جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ کوکرناگ میں پہاڑ کے دامن میں ایک چشمہ جاری ہے جس سے چاندی جیسا سفید وشفاف پانی اچھل اچھل کر نکل رہا تھا۔ یہ پانی ایک ندی کی صورت میں بالآخر دریائے جہلم میں جا ملتا ہے۔ چشمہ کے قریب تاحدِ نظر گلاب کی کاشت ہوتی ہے۔ اور چنار کے درخت عجب بہار دکھاتے ہیں۔ ہمارے میزبانوں نے ہمارے لئے چنار کے ایک درخت کے نیچے کرسیاں بچھا دیں۔ اور ہم قدرت کے حسین مناظر میں کھو گئے۔

اس وقت مجھے علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آئے اور اس کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ یہ اشعار اسی جگہ پڑھنے کے لائق ہیں اگر انہیں حیدرآباد سندھ سے کراچی جاتے ہوئے ریل گاڑی میں پڑھا جائے یا ان کا درۂ خیبر سے گذرتے وقت مطالعہ کیا جائے تو پھر خاک مزہ نہ آئیگا[۱]۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

رخت بہ کاشمیر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر
لالہ ز خاک بردمید موج بہ آبِ جو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

---

[۱] حیدرآباد سے کراچی تک سفر کرتے ہوئے خشک علاقہ میں تاحدِ نظر تھوہڑ (زقوم) کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ درۂ خیبر بھی بے آب و گیاہ جگہ ہے۔

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگین گریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

اب آپ ہی دیکھئے کہ ہمارے قریب چشمہ کا پانی آب شکن شکن نگر کی تشریح کر رہا تھا چنار کے درختوں پر صلصل وسار زوج زوج بیٹھے نغمہ سنجی میں مصروف تھے، ندی کا پانی با تجو نمید کا سماں باندھ رہا تھا گلاب۔ کے پھول لالہ چمن چمن نگر کا منظر پیش کر رہے تھے اور پہاڑوں پر اگے ہوئے دیودار کے درخت سبزہ جہاں بہ بیں کی غمازی کر رہے تھے پھولوں کی رنگت خاک شرر بہ شرر بہ بیں کی ترجمانی کر رہی تھی چاروں طرف بہار فوج فوج آئی ہوئی تھی ایسے میں اگر کوئی زخمہ بہ تار ساز زن شروع کر دیتا تو ہمارے دلوانہ ہونے میں کیا کسر باقی رہ جاتی۔ اگر ایسا منظر دیکھ کر شاعر فطرت بے اختیار قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر نہ کہے تو اور کیا کہے گا۔

ہماری رہائش حضرت بل میں کشمیر یونیورسٹی کے صدر دروازے کے بالمقابل محکمۂ وقاف کے ایک نئے تعمیر کردہ مہمان خانے میں تھی سامنے ڈل کا منظر تھا ڈل کے عقب میں چشمۂ شاہی، نشاط باغ اور شالامار باغ تھے حضرت بل سے شہر جاتے ہوئے ہمیں اشائی باغ سے گذرنا ہوتا تھا پل کے دونوں جانب بید مجنوں کے درخت تھے جن کی ٹہنیاں جھک کر سطح آب سے سرگوشیاں کرتی نظر آتی ہیں یہیں آپ کو تیرتے ہوئے کھیت ملیں گے جو کشمیر علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتے۔ کبھی کبھی پھل اور سبزی بیچنے والی دوشیزہ اپنا شکارہ کھیتے ہوئے ین باغ کی طرف جاتے ہوئے آجاتی ہیں نگین باغ میں صدہا ہاؤس بوٹ کھڑے تھے جن اہل ثروت رہائش پذیر تھے۔

اشائی باغ کے پل سے گذرتے وقت علامہ اقبال کے ان اشعار کی طرف میری توجہ بدول ہو جاتی تو ان اشعار کا لطف سہ آتشہ ہو جاتا تھا وہ اشعار یہ ہیں۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ

پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

ان اشعار کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کو منظر کشی میں ید طولیٰ حاصل تھا وہ صرف لفظوں کے طلسم سے فطرت کی بڑی عمدہ تصویر کھینچ دیتے تھے انہوں نے دریائے نیکر کے کنارے اور مسجد قرطبہ پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کی منظر کشی کا بہترین نمونہ ہیں۔ اگر اقبال مصور بھی ہوتے تو اس سے بہتر منظر کشی نہیں کر سکتے تھے۔

۱۹۶۸ء میں راقم الحروف کو علی گڈھ جانے کا موقعہ ملا جولائی کے دن تھے پنجاب میں اس سال شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں مئی اور جون کی گرمی لاہور میں برداشت کر کے علی گڈھ گیا تو مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے فرمایا کہ چند روز کے لئے پہاڑ پر ہو آؤ۔ میں اپنی اہلیہ اور بڑے بچے ظفر کو ساتھ لے کر علی گڈھ سے بریلی ہوتا ہوا کاٹھ گودام پہونچا، یہ چھوٹی لائن کا آخری اسٹیشن ہے وہاں سے ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی اور ہم نینی تال روانہ ہوئے، ستائیس میل کا یہ راستہ ہمالیہ کے دامن سے گزرتا ہے اور درختوں نے سڑک کو ڈھانپ رکھا ہے یہاں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ایک سرسبز سرنگ میں سے گذر رہے ہیں۔ ہر دو تین فرلانگ کے بعد آبشار ملتی تھی کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ میں ہم نینی تال پہونچ گئے۔

بس اسٹینڈ سے ہمالیہ کی کئی فلک بوس چوٹیاں نظر آرہی تھیں ہمالیہ کو دیکھ کر مجھے علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آگئے ؎

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں!
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں

تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے
تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن۔
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن۔
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

نینی تال سطح سمندر سے ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند ہے وہاں کوئی سوا میل لمبی اور نوّے فٹ گہری جھیل ہے جو آنکھ سے مشابہت رکھتی ہے اس کے ایک طرف ہوٹل ہیں جنکی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی ہیں اور دوسری جانب ایک بلند و بالا پہاڑ ہے جس پر گورنر کا بنگلہ بنا ہوا ہے ہمارے ہوٹل کے عقب میں بھی پہاڑ تھا بارش کا پانی اور مچاتا اور پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے آتا۔ ہر ہوٹل کے دونوں جانب پختہ نالے بنے ہوئے تھے جن کے ذریعہ وہ پانی جھیل میں جا گرتا تھا نینی تال کی روح پرور فضا چیڑ درختوں کی خوشبو بہتا ہوا سیماب جیسا پانی ہوٹل کے برآمدوں میں لٹکے ہوئے گملوں میں خوشرنگ کلیاں، پہاڑ کی ڈھلوان پر خودرو پھول دیکھ کر حضرت علامہ کے یہ اشعار یاد آگئے۔

رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا ۔ آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا
لالہ اندر خلوتِ کہسار ہا ۔ نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا۔

بالکل ایسا ہی منظر ہمیں ۱۹۶۷ء میں پہلگام میں نظر آیا نو ہزار فٹ بلند سرسبز پہاڑ

کے دامن سے دریائے لدھرو گذرتا ہے دوسری جانب چھوٹا سا بازار اور گنتی کے چند ہوٹل ہیں۔ ہم پام ویو ہوٹل میں ٹھہرے، چندے آرام کے بعد سیر کو نکلے تو دریا کے کنارے امرتسری تاجروں کی تعمیر کردہ مسجد دیکھی، مسجد میں وضو کا انتظام نہیں اور وضو کیلئے لدھرو تک سیڑھیاں اترتی ہیں نماز مغرب کا وقت ہورہا تھا اور پہاڑوں پر شفق کی سرخی کا عکس پڑنے لگا تھا۔ پہاڑوں پر درخت چپ چپ کھڑے تھے جیسے رات کی تاریکی کے خوف سے سہمے ہوئے ہوں، لدھرو کی موجیں مسجد کی دیواروں کو چومنے آتی تھیں۔ پانی کے پتھروں سے ٹکرانے سے عجیب سی آواز پیدا ہوتی۔ بے ذوق قسم کے لوگ تو اسے شور بیجا ہی کہیں گے۔ لیکن صوفی باصفا کی توجہ فوراً يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ کی طرف مبذول ہوجاتی ہے اور اسے اس شور بیجا میں نغمہ توحید سنائی دینے لگتا ہے۔

لدھرو کو دیکھ کر مجھے علامہ اقبال کے یہ شعر یاد آگئے اور ان اشعار نے جو لطف پہلگام میں لدھرو کے کنارے دیا ویسا لطف شاید ہی کسی دوسری جگہ آئے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلی شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا — دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

یادش بخیر! مولانا ابو العرفان ندوی اور مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی میرے

تھے مفتی صاحب دریا کا نام بھول جاتے اور چند منٹ بعد مجھ سے پوچھتے! کیوں بھئی اس دریا کا بھلا کیا نام ہے؟ میں جواب میں پھر عرض کرتا تو دو تین بار اس نام کو دہراتے اور چند منٹ بعد پھر وہی سوال ہوتا کیوں بھئی اس دریا کا بھلا کیا نام ہے!

اگر کسی صاحب نے کبھی سمندر کے کنارے بیٹھ کر طلوع یا غروب آفتاب کا منظر دیکھا ہو تو اس سے پوچھیے کہ سورج کس طرح اچھل کر سمندر کی سطح سے ابھرتا ہے اور اسی طرح غروب ہوتے وقت سمندر میں ڈبکی لگا جاتا ہے، ہمارے ایسے شہروں کے باسی فطرت کے اس منظر سے ناآشنا ہیں، مولانا عبداللہ قریشی نے راقم الحروف کو بتایا کہ ایک بار علامہ اقبال، خوشی محمد ناظر، مولوی احمد دین، صاحبزادہ محمد عمر اور منشی سراج الدین کشتی میں سوار ڈل کی سیر کر رہے تھے علامہ مرحوم نے سورج کو ڈوبتے دیکھ کر فی البدیہہ کہا ؎

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام ۔ دہد شعلہ را آشیاں زیر آب
بشوید ز تن تا غبار سفر ۔ زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

یہ بات شاعر فطرت ہی کہہ سکتا تھا کہ سورج دن بھر کے سفر سے تھک گیا تھا اس لئے وہ رخصت ہوتے وقت ڈل میں نہا کر گرد سفر اپنے بدن سے اتار گیا۔

علامہ اقبال نے یورپ جاتے ہوئے عرشہ جہاز سے کئی بار غروب آفتاب کا منظر دیکھا تھا جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا ہے وہی ان اشعار کا لطف اٹھا سکتے ہیں ؎

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو ۔ طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور ۔ قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی ۔ چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے ۔ کہتا ہے جسکو انساں اپنی زباں میں تارے

یہ ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے میں بچوں کے ساتھ علی گڑھ گیا ہوا تھا جولائی کا مہینہ تھا ایک روز میں نے اپنے بڑے بیٹے ظفر سے جس کی عمر اس وقت گیارہ سال کے لگ بھگ تھی

کہا ! کہ چلو تمہیں آگرہ دکھاؤں علی گڈھ سے آگرہ کوئی تریپن میل ہے اور بس یہ سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرلیتی ہے ہم دونوں قبل دوپہر آگرہ پہونچ گئے وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا اور دوپہر کا کھانا کھا کر سکندرہ چلے گئے وہاں اکبر کا مقبرہ دیکھا اور عصر کے قریب ہم قلعہ دیکھنے گئے قلعہ سے فارغ ہو کر ہم تاج محل پہونچے ، گھنٹہ بھر اسے خوب دیکھا بلکہ یوں کہیے کہ تاج کے حسن کو اپنے اندر جذب کرتے رہے نماز مغرب کے بعد ہم نے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چاند طلوع ہونے کا انتظار کیا ۔

اس دوران میں آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ تاج کے باغ میں ہزاروں کی تعداد میں جگنو جھلملاتے ہوئے نظر آئے ۔ جمنا کا کنارہ تاج کا باغ برسات کی رات اور گھپ اندھیرے میں جگنوؤں کی جھلملاہٹ ایک عجیب سماں باندھ رہی تھی میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ وہاں اقبال کے ان اشعار نے جو لطف دیا وہ پہلے کبھی نہیں ملا تھا حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں ‌ ‌ یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ ‌ ‌ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا ‌ ‌ غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا ‌ ‌ ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

۲۲ جولائی ۱۹۷۶ء کا ذکر ہے غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدینؒ میں احوال و آثار حضرت مجدد الف ثانیؒ کے موضوع پر میری تقریر تھی ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کرسی صدارت پر رونق افروز تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ بڑی تعداد میں آڈیٹوریم میں موجود تھے ۔ تقریر کے اختتام پر چائے کا انتظام تھا اس موقعہ پر دہلی کی نامور شخصیتوں سے ملاقات ہوئی تقریر کے اختتام پر غالب آشفتہ سر کے مزار پر حاضری دی نو معاً میرے ذہن میں علامہ اقبال کے یہ اشعار ذہن میں آگئے ؎

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر ،

محوِ حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر
آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

روایت ہے کہ ایک بار حضرت علامہ دہلی تشریف لائے تو خواجہ حسن نظامی نے غالب کے مزار پر قوالی کا اہتمام کیا اس موقعہ پر قوالوں نے غالب کی یہ غزل چھیڑی ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ
تکلیف پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب، کہ لذت خواب سحر گئی

راوی کہتا ہے کہ جب قوال بار بار "اٹھیے بس اب، کہ لذت خواب سحر گئی" دہراتے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ غالب آنکھیں ملتا ہوا قبر سے باہر نکل آئے گا۔

غالب کے مزار سے باہر نکلا تو "چبوترہ یاران" کے پاس سے گذرتا ہوا درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے دستور کے مطابق حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر حاضری دی، پھر آہستہ آہستہ سلطان جی کے مزار اقدس کی طرف روانہ ہوا، فاتحہ خوانی کے بعد میں کچھ دیر کے لئے وہیں بیٹھ گیا اس وقت میرے ذہن میں اقبال کے یہ اشعار گھومنے لگے ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جسکو وہ نام ہے تیرا بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
پنہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

میری ناقص رائے میں ان اشعار کو پڑھنے کے لئے سلطان جی کی درگاہ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

یہ غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مانٹریال سے علی گڈھ جاتے ہوئے چند روز کے لئے لندن میں رُکے میں کیمبرج سے ان سے ملنے آیا۔ موصوف نے میرے ساتھ ویسٹ منسٹر ایبے، بکھنگم پیلس، انڈیا آفس لائبریری اور ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ دیکھے بعد ازاں میں انہیں ہائی گیٹ کے قبرستان میں لے گیا۔ ابتداءً میں موصوف ذرا حیرت زدہ ہوئے کہ میں انہیں کہاں لے آیا ہوں۔ جب میں نے انہیں کارل مارکس کی قبر دکھائی تو انہیں اطمینان ہوا کہ میں انہیں بلا وجہ یہاں نہیں لایا۔ مولانا فرمانے لگے کہ ہمیں اس کے نظریات سے بڑا اختلاف ہے لیکن ماننا پڑے گا کہ وہ عظیم انقلابی تھا اقبال لندن میں رہے ہیں انہوں نے بھی یہ قبر ضرور دیکھی ہوگی عین ممکن ہے کہ انہوں نے یہ اشعار اسی زمانے میں کہے ہوں ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل ۔ یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است ۔ قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را ۔ در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک ۔ جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخِ او در دل نہ در آب و گِل است

ہم کافی دیر تک اس کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کی قبر کو دیکھتے رہے۔ یہاں انگریزوں کی فراخدلی کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی جب اس یہودی النسل (از نسل خلیل) مفکر کو اس کے ہم وطنوں نے جرمنی سے نکال دیا تو اسے انگلستان میں پناہ ملی جو اس زمانہ میں سرمایہ دار ملکوں میں سرِ فہرست تھا اور یہیں اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف سرمایہ لکھی جس پر آج روس اور اس کے حواری ملکوں کے آئین کی بنیاد ہے۔ اگر کارل مارکس روس میں بیٹھ کر یہ کتاب لکھتا تو زار روس اسے سائبیریا کے کسی بیگار کیمپ میں بھیج دیتا۔

یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے میں انگلستان سے خشکی کے راستے پاکستان آتے ہوئے بیت المقدس پہونچا باب ساہرہ کے باہر ریوالی ہوٹل میں قیام کیا اور نہا دھو کر مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ دیکھنے گیا حرم شریف کا دروازہ باب السلسلہ کہلاتا ہے اور اس کا بواب ایک ہندی نژاد مسمیٰ اقبال احمد تھا میں نے اس سے مولانا محمد علی جوہر کے مدفن کے بارے میں سوال کیا تو اس نے ایک حجرے کی طرف اشارہ کیا میں آگے بڑھا تو ایک لوح مزار پر البطل حریت مولانا محمد علی الہندی کندہ دیکھا میں بڑی عقیدت کے ساتھ آگے بڑھا اور فاتحہ پڑھی، اس وقت مجھے علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آگئے ؎

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گذشت
اے خوشا مشتِ غبار او کہ در جذب حرم
از کنار اندلس از ساحل بربر گذشت
خاک قدس او را با غوش تمنا در گرفت

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت
می نہ گنجد جز بآں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گذشت
جلوۂ او تا ابد باقی بچشم آسیاست
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گذشت

اقبال کے ان اشعار میں سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت کا لطف اس وقت آتا ہے جب زائرین مولانا جوہر کے مزار سے چند گز کے فاصلے پر اس جگہ سے گذرتے ہیں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج انبیاء کرام کو نماز پڑھائی تھی اس مصرع میں سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی ۔ کی طرف بلیغ اشارہ ہے اور اسی مقام سے معراج کا اگلا مرحلہ شروع ہوا تھا۔

برطانوی سامراج کو برطانوی حکومت کے پایۂ تخت میں للکارنے والے بطلِ حریت مولانا محمد علی جوہر کے مزار سے ملحقہ حجرے میں انگریزوں کا زلہ رُبا اور ناموس دین مصطفیٰ کا بیوپاری حسین شریف مکہ مدفون ہے مولانا مرحوم کی روح کے لئے اس ننگ قوم کے قرب سے بڑھ کر اور کوئی چیز باعث تکلیف نہیں ہو سکتی۔

حسین شریف مکہ نے پہلی عالمی جنگ کے دوران میں انگریزوں کے ایجنٹ کرنل لارنس کے اشارے پر ترکوں کے خلاف بغاوت کردی تھی اور حرمین شریفین میں متعین ترک محافظوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھدیا تھا۔ حسین کے رویتے سے مسلمانوں کے مفادات کو بڑا نقصان پہونچا۔ اقبال نے ایسے ہی غداروں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں جہنم بھی قبول نہیں کرتی۔ علامہ صاحب نے میر جعفر کے بارے میں جو اشعار کہے تھے وہ حسین پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است

ایں مسلمانے کہن ملت کش است
خند خنداں است و با کس یار نیست
مار اگر خنداں شود جز مار نیست
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم
ملتِ او از وجودِ او لئیم
ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصلِ او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روح جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

مجھے ان اشعار نے شریف مکہ کے مزار پر بڑا مزہ دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ اقبال کے یہ اشعار شریف مکہ جیسے غدار کے قبر پر ہی پڑھنے کے لائق ہیں۔

اسی سفر کے دوران مجھے قسطنطنیہ میں چار روز قیام کا موقع ملا، اور میں نے دو بار حضرت ابو ایوب خالد انصاریؓ کے مزار کی زیارت کی مجھے زندگی میں پہلی بار کسی صحابی کے مزار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا اس لئے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے قسطنطنیہ کی ایک ایک تاریخی عمارت دیکھی ترکوں نے شہر کی فصیل کا بیشتر حصہ گرا دیا ہے لیکن اس دروازے کو جس سے سلطان محمد فاتح شہر میں داخل ہوا تھا محفوظ رکھا ہے قسطنطنیہ کی عظمت رفتہ، سلاطین عثمانی کے مزارات اور ان کی تعمیر کردہ عالیشان مساجد مسجدوں کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مینار، باسفورس کے کنارے توپ کاپی کی عمارت اور اس کے اندر محفوظ تبرکات نبویؐ کی زیارت کا روح پرور نظارہ اب تک نظروں کے سامنے ہیں۔ اقبال نے اس شہر کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار — مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پائیدار

صورت خاک حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسندِ شہ آرائے شہ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اسکی ہوا — تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

اے مسلماں ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر،
سینکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

جس شخص نے اس شہر کو نہیں دیکھا وہ ان اشعار سے کما حقہ حظ نہیں اٹھا سکتا، اور اسی طرح جس شخص نے امیر بایزید کے حملہ سے لیکر سلطان محمد فاتح کے حملہ تک اس شہر پر، مسلمانوں کی یلغاروں کی تاریخ نہیں پڑھی وہ بھی آخری مصرع سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

استنبول سے بروصہ تک بس میں تقریباً آٹھ گھنٹے کا سفر ہے سڑک ابنائے باسفورس اور مارمورا کے ساتھ ساتھ جاتی ہے سڑک کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف سمندر ہے اگر ڈرائیور ذرا سی غفلت برتے تو بس سمندر میں گر جائے بروصہ عثمانی سلاطین کا قدیم پایۂ تخت ہے اور قسطنطنیہ کی فتح تک یہی شہر ان کا دارالحکومت تھا۔

شہر کے وسط میں سلطان محمد اول کا سبز رنگ کا مقبرہ ہے اور اس کے قریب ہی بایزید یلدرم کا مزار ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر دولت عثمانیہ کا بانی عثمان خاں اور اس کا فرزند اورخاں محو خواب ابدی ہیں۔ اس سے فرلانگ بھر دور ایک کنج عمیق میں مشرقی یورپ میں تہلکہ مچا دینے والا سلطان مراد الیاجری مجاہد محو استراحت ہے سلطان کے مزار پر نظر پڑتے ہی مجھے حضرت علامہ کے یہ اشعار یاد آگئے ہے

بود معمارے ز اقلیم خجند — در فن تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد — مسجدے از حکم سلطان مراد
خوش نیامد شاہ را تعمیر او — خشمگیں گردید از تقصیر او
آتش سوزندہ از چشمش چکید — دست آں بیچارہ از خنجر برید

معمار نے اس ظلم و تعدی کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا تو قاضی

نے سلطان کو عدالت میں طلب کر کے اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ سلطان کے اقرار جرم پر قاضی نے کہا :۔

عبد مسلم کمتر از احرار نیست | خون شہ رنگین تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آئینہ محکم شنید | دست خویش از آستین بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند | آئینہ با لعدل والاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش | از برائے مصطفےٰ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر | سطوت آئین پیغمبر نگر
پیش قرآں بندہ و مولا یکے است | بوریا و مسند دیبا یکے است

اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا یہ واقعہ میرے سامنے گزر رہا ہے قاضی القضاۃ مسند عدل پر تشریف فرما ہیں۔ ان کے سامنے قرآن مجید پڑا ہے مدعی کے کٹے ہوئے ہاتھ سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں اور سلطان مراد آستین چڑھائے اپنا ہاتھ کٹوانے کے لئے تیار کھڑا ہے قاضی صاحب جلاد کی طرف دیکھ رہے ہیں اور وہ ان کے اشارۂ ابرو کا منتظر ہے میں کافی دیر اسی خیال میں مستغرق سلطان مراد کی ابدی خوابگاہ کی طرف دیکھتا رہا اس مرد مجاہد نے عدل و انصاف کا وقار کتنا بلند کر دیا ہے۔

۱۹۷۰ء میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی تغلق آباد میں رہتے تھے۔ میں لاہور سے بچوں کو ساتھ لے کر دہلی آیا اور چھتیس روز ان کے ساتھ ٹھہرا ایک دن میں ز فر کو ساتھ لے کر دہرولی پہنچا اور اسے قطب مینار اور مسجد قوت الاسلام دکھائے یہ مسجد اب بالکل شکستہ حالت میں ہے البتہ اس کی ایک بلند و بالا محراب آفات سماوی و ارضی کا مقابلہ کرنے کے لئے اب تک اپنی اصلی حالت میں کھڑی ہے ایک بار پروفیسر محمد مجیب ایک روسی آرٹسٹ کی معیت میں اسے دیکھنے گئے تو اس آرٹسٹ نے انہیں بتایا کہ اسے اس محراب میں وہ کامل سکون نظر آتا ہے جو گوتم بدھ کے مجسموں کی شان ہے اس میں ایلی فینٹا کے غاروں کی تری مورتی کا ابدی مراقبہ ہے۔ اس

میں صوفی کا وجد ہے عاشق کامل کا صبر اور وہ دل آویزی ہے جسے بیان کرنے کی آرزو شاعروں کے دل کو حسرت سے آباد رکھتی ہے یہ محراب فن سنگ تراشی سے بالاتر کوئی چیز ہے ایک دروازہ جس سے گذر کر ہم تصورات اور احساسات کی ایک لامحدود فضاء میں پہونچ جاتے ہیں ۔

مسجد قوۃ الاسلام دہلی مرحوم کی عظمت رفتہ کی یادگار ہے اقبال نے اندلس میں مسجد قرطبہ کو دیکھ کر جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ اس مسجد پر بھی منطبق ہوتے ہیں قوت الاسلام کے صحن میں کھڑے ہو کر جب میری نظر قطب مینار پر پڑی تو مجھے اقبال کے یہ اشعار یاد آگئے ؎

تیرا جلال و جمال، مرد خدا کی دلیل   وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار، تیرے ستون بیشمار   شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور   تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے   اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم و خلیل

۱۹۶۵ء میں مجھے تیرہ دن "خطہ مینو نظیر" میں گذارنے کا موقع ملا ۔ اس سے کچھ عرصہ پیشتر مجھے امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ پر سیدہ اشرف بخاری کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ۔ میرے دل میں اس بزرگ کی بڑی عزت تھی موصوف خود تو کولاب (علاقہ روس) میں مدفون ہیں لیکن ان کی خانقاہ سری نگر میں تا حال مرجع خلائق ہے خانقاہ معلی کی شاندار عمارت دریائے جہلم کے کنارے کھڑی ہے میں نے اس عمارت کو دیکھا تو مجھے وہ اشعار یاد آگئے جن میں علامہ اقبال نے شاہ ہمدان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے حضرت علامہ فرماتے ہیں

مرشد آں کشور مینو نظیر   میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستیں   داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر   با ہنر ہائے غریب و دل پذیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ   خیز و تیرش را بدل راہے بدہ

ایک دوسرے موقعہ پر علامہ مرحوم نے مرشد آں کشور مینو نظیر کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے

سیدانِ ذاتِ سالارِ عجم ۔۔۔ دستِ او معمارِ تقدیرِ امم

مجھے چونکہ سیدہ اشرف کے مقالہ کو بار بار پڑھنے کا موقعہ ملا تھا اس لئے مجھے اس معمارِ تقدیرِ امم کے کارناموں سے بخوبی واقفیت تھی بریں وجہ مجھے ان اشعار نے جو مزہ خانقاہ مولیٰ کے صحن میں دیا ویسا مزہ شاید ہی کسی نے لیا ہو.

۱۹۶۷ء کے اوائل میں مجھے قونیہ میں حضرت مولانا جلال الدین رومی کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی ان کے مزار کے صدر دروازے پر یہ شعر کندہ ہے :

کعبۃ العشاق باشد ایں مقام ۔۔۔ ہر کہ ناقص آمد اینجا شد تمام

میں اس شعر کا لطف اٹھاتا ہوا خانقاہ میں داخل ہوا اس وقت وہاں ٹیپ ریکارڈ چل رہا تھا جس میں نے بج رہی تھی کسی نے نواز نے بڑے دردانگیز لے میں مثنوی معنوی ٹیپ کروائی تھی جب زائرین ایک پرشکوہ گنبد میں مولانا رومی کے مزار کے سامنے کھڑے ہوتے تو نے کی آواز سن کر ان کے آنسو نکل آتے. ترک ان کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ میں نے بعض عقیدتمندوں کو وہاں سربسجود دیکھا.

یہ وہی تاریخی بلکہ تاریخ ساز خانقاہ ہے جس میں مولانا اپنی ابتدائی زندگی میں

از کششاف گفت واز اشراق گفت ۔۔۔ وز حکم صد گوہر تابندہ سفت

عقدہائے قول مشائیں کشود ۔۔۔ نور فکرش ہر خفی را وانمود

گرد و پیشش بود انبارِ کتب ۔۔۔ بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

پھر ایک دن کیا ہوا کہ

پیرِ تبریزی ز ارشادِ کمال ۔۔۔ جست راہِ مکتبِ ملا جلال

گفت ایں غوغا و قیل و قال چیست ۔۔۔ ایں قیاس و وہم و استدلال چیست

مولوی رومی نے ایک بار پریشان حال اجنبی کی زبان سے یہ کلمات سن کر کہا

مولوی فرمود ناداں لب بہ بند ۔۔۔ بر مقالاتِ خردمنداں مخند

پائے خویش از مکتبم بیروں گذار ۔۔۔ قیل و قال است ایں ترا با وے چہ کار

حال ما از فہم تو بالاتر است
شیشۂ ادراک را روشن گر است

پھر کیا ہوا ؎

سوز شمس از گفتۂ ملا فزود
آتش از جان تبریزی کشود
بر زمیں برقِ نگاہ او فتاد
خاک از سوز دم او شعلہ زاد
آتش دل خرمن ادراک سوخت
دفتر آں فلسفی را پاک سوخت

اُدھر عالم یہ تھا اور اِدھر ؎

مولوی بیگانہ از اعجاز عشق
ناشناس نغمہائے ساز عشق
گفت ایں آتش چساں افروختی
دفتر ارباب حکمت سوختی

مولوی صاحب کی بات سن کر شمس تبریزی نے جواب دیا ؎

گفت شیخ اے مسلم زنار دار
ذوق و حال است ایں ترا با وے چہ کار
حال ما از فکر تو بالاتر است
شعلہ ما کیمیائے احمر است

مولانا رومی نے یہ سن کر کہا ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن
روئے خود را جانب دلدار کن

قونیہ میں مولانا رومی علیہ الرحمۃ کے مزار کے احاطے میں ان اشعار نے جو سرور دیا اس کی چاشنی اب تک لذت کام و دہن کا کام دے رہی ہے۔

۱۹۶۹ء میں دکن کے سفر میں مجھے خلد آباد جانے کا اتفاق ہوا لب سڑک آمنے سامنے دو خانقاہیں ہیں ایک خانقاہ میں حضرت برہان الدین غریبؒ، نظام الملک آصف جاہ ناصر جنگ شہید اور کئی نامور ہستیاں محو خواب ابدی ہیں۔ دوسری خانقاہ میں حضرت زین العابدین استراحت فرما ہیں۔ ان کے مزار کے پائنتی ایک حجرے میں شہزادہ محمد اعظم اور دوسرے حجرے میں شاہ عالمگیر گردوں آستاں مدفون ہیں۔ گردوں آستاں کی قبر کچی ہے اور اس پر ایک نازبو کا پودا اُگا ہوا تھا

میں نے مجاور سے پوچھا کہ ان کی قبر اتنی سادہ کیوں ہے؟ اس نے کہا کہ اور چھ روپے میں کیا بن سکتا تھا اسکا اشارہ اس رقم کی طرف تھا جو بادشاہ نے اپنے کفن دفن کے لئے چھوڑی تھی میں کافی دیر تک سر جھکائے وہاں کھڑا رہا اس وقت میرے ذہن میں اقبال کے یہ اشعار تھے :-

شاہ عالمگیر گردوں آستاں ۔۔۔ اعتبار دودمان گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر ازو ۔۔۔ احترام شرع پیغمبر ازو
درمیان کارزار کفر و دیں ۔۔۔ ترکش ما را خدنگ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید ۔۔۔ باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود ۔۔۔ ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را ۔۔۔ آں فقیر صاحب شمشیر را
از پئے احیائے دیں مامور کرد ۔۔۔ بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت ۔۔۔ شمع دیں در محفل ما برفروخت
کور ذوقاں داستانہا ساختند ۔۔۔ وسعت ادراک او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود ۔۔۔ چوں براہیم اندریں بت خانہ بود
در صف شاہنشہاں یکتاستے ۔۔۔ فقر او از تربتش پیدا ستے

اس آخری بند کے دوسرے مصرع کا لطف اسی وقت آسکتا ہے جب چھ روپے کی لاگت سے تیار ہونے والی قبر سامنے ہو تاج محل کے احاطے میں یہ مصرع پڑھنے سے خاک مزہ نہ آئے گا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد پنجاب میں ناظموں کا دور حکومت شروع ہوا، یہ لوگ حضرت خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار کی نسل سے تھے تقویٰ اور پرہیزگاری عدل اور انصاف اس خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس خاندان کی ایک عظیم المرتبت خاتون شرف النساء بیگم پورہ لاہور میں مدفون ہے اسے مطالعہ کا بڑا شوق تھا اور اس کا زیادہ تر وقت اسی شوق کی نذر ہوتا تھا

یہ نیک خاتون ہمیشہ اپنے پاس مصحف پاک کا ایک نسخہ اور ایک دو دھاری تلوار رکھتی تھی اس نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد بھی ان دونوں تبرکات کو اس سے جدا نہ کیا جائے۔ اس کی خواہش کے مطابق قرآن مجید اور تلوار اس کے تابوت میں رکھدیئے گئے۔ عوام کے نزدیک یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن شاعر مشرق نے اس سے بڑا اچھا نتیجہ اخذ کیا ہے مجھے پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم کے ہمراہ کئی بار اس مقبرہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں جب بھی وہاں گیا مجھے حضرت علامہ کی مشہور نظم قصر شرف النسار یاد آگئی۔ موصوف شرف النسار کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

قلزم ما این چنین گوہر نزاد — ہیچ مادر این چنین دختر نزاد
خاک لاہور از مزارش آسمان — کس نداند راز او را در جہاں
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکم پنجاب را چشم و چراغ
آن فروغ دودۂ عبدالصمد — فقر او نقشے کہ ماند تا ابد
تاز قرآن پاک می سوزد وجود — از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمر تیغ دو رو قرآن بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز
بر لب او چوں دم آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از راز من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند — کائنات زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس — دخترت را این دو محرم بود و بس
وقت رخصت با تو دارم ایں سخن — تیغ و قرآن را جدا از من مکن
دل بہ آں حرفے کہ می گویم بنہ — قبر من بے گنبد و قندیل بہ

تقریباً پون صدی تک قرآن و تلوار اس کی قبر میں موجود رہے جب پنجاب سکھوں